رتن ناتھ سرشار کے ناولوں میں متوسط طبقے کے مسائل اور کردار کا جائزہ

ڈاکٹر جویریہ انور

پنجاب گروپ آف کالجز، لاہور

ڈاکٹر ذوالفقار علی

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، گورنمنٹ پوسٹ گریجوایٹ کالج اصغر مال راولپنڈی

Abstract

Middle class has been picturised significantly in Urdu novel. Ratan Nath Sarshar's novels have vast range of characters. In this article, it is fiscucussed that he has analysed characters of middle class in his novels especially with reference to his contemporary society of subcontinent focused.

کسی ادیب نے کہا تھا کہ فن کی شہرت اور فنکار کی گمنامی ایک حادثہ ہے جس کا اعادہ تاریخ میں عموماً ہوتا رہتا ہے۔ کم و بیش ایسی ہی صورت حال کا سامنا پنڈت رتن ناتھ سرشار کے حالاتِ زندگی کی سراغ رسانی میں بھی محققین کو کرنا پڑا۔

سرشار کی ولادت کے بارے میں محققین کی رائے محض قیاس کی حد تک محدود ہے کہ سرشار لکھنؤ میں ۱۸۴۶ء تا ۱۸۴۷ء میں پیدا ہوئے۔ اُن کے خاندان کا وطن لکھنو تھا اور آبا و اجداد کا مسکن کشمیر اور یہ امر بھی گوشہ گمنامی ہی میں ہے کہ اُن کا خاندان کب آکر لکھنؤ میں آباد ہوا ہے۔ والد کا نام پنڈت بیج ناتھ در تھا۔ ''در'' سرشار کی گوتر تھی اس کے سراغ میں احراز نقوی لکھتے ہیں:

> ''در سرشار کی گوتر تھی اور اُن کے مورث اعلیٰ ایک رشی بزرگ تھے جن کا پورا نام ''در بہادر واج'' تھا۔ ثقہ روایت ہے کہ رشی بزرگ کی دو بیبیاں تھیں جن میں ایک برہمن زادی تھی اس کے بطن سے جو اولاد تولید ہوئی وہی در کہلائی اور اس در کے بعد جو نود پود پھولی پھلی وہ در خاندان کہلائی چنانچہ در گوتر در بہادر واج سے نکلی۔'' (۱)

آپ کے والد ایک باعزت کشمیری پنڈت تھے مگر سرشار کی عمر ابھی ۴ برس کی ہی تھی کہ والد کا سایہ شفقت سر سے اُٹھ گیا۔ ابتدائی تعلیم میں حسبِ رواج عربی اور فارسی مدرسے سے سیکھی اور لکھنؤ میں شاہی دور کے خاتمے اور انگریزی زبان کی نمود کے ساتھ کیننگ کالج میں انگریزی زبان کی تعلیم حاصل کی۔ اب اسے فیضانِ نظر کہیے یا مکتب کی کرامت یا سب سے بڑھ کر ذاتی کاوش و ذکاوت کہ سرشار کی رسمی تعلیم کی طرف بے اعتنائی، مدرسی قوانین وضوابط سے لاپرواہی کے باوجود انگریزی زبان پہ دسترس قابلِ ستائش حد تک بہتر تھی۔ اُردو وہ اپنی ہمسائیگی میں مقیم اہلِ اسلام کی مخدرات سے زمانۂ طفولیت میں ہی سیکھ چکے تھے اور لکھنوی طرزِ

معاشرت اور آداب و رسومات سے گہری آگہی جو اُن کی تصانیف میں نمایاں نظر آتی ہے اسی صحبت کا منطقی نتیجہ ہے۔ ڈاکٹر احراز نقوی اسی لاپرواہی اور ذکاوت و ذہانت کا ذکر کرتے ہوئے منوہر لال جگر بریلوی کی کتاب ”یادِ رفتگان“ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

> ”راقم الحروف کے والد اور سرشار اس کالج میں ہم سبق تھے وہ فرمایا کرتے تھے کہ استادوں نے رتن ناتھ کو آزاد کر رکھا تھا۔ ننگے سر بال بکھرے ہوئے اچکن کے بٹن کھلے عجیب لااُبالی انداز سے کلاس میں آتے تھے۔ پڑھنے سے کوئی سروکار نہ تھا۔ ایسے میں کوئی ڈگری کیونکر ملتی۔“ (۲)

کالج کی تعلیم بغیر ڈگری حاصل کیے چھوڑی اور فکرِ معاش کے لیے کھیری (یوپی) میں کسی سکول میں مدرس ہوئے۔ کشمیری پنڈتوں کے ایک ماہ نامے ”مراسلہ کشمیری“ میں آرٹیکل لکھنے شروع کر دیئے۔ یوپی ہی کے سررشتہ تعلیم کی طرف سے نکلنے والے ایک رسالہ میں آپ نے انگریزی کے مضامین ترجمہ کر کے بھیجنے شروع کیے تو سررشتہ تعلیم کی سالانہ روئیداد میں مہتمم اعلیٰ نے اعلان کیا کہ پنڈت رتن ناتھ در سے زیادہ صحیح اور بامحاورہ ترجمہ کسی کا نہیں ہوتا یہ بات بھی اُن کی انگریزی شناسی پہ دال ہے۔ انہی کی سفارش اور تعارف پہ بعد ازاں سرشار کو منشی نول کشور نے اخبار اودھ کی ادارت پہ ملازم رکھا اور سرشار کی زندگی میں یہ ملازمت ایک نہایت اہم اور نمایاں موڑ ثابت ہوئی۔ سرشار نے یہاں بھی اپنی انگریزی شناسی کا اور ادبی مذاق کا نمایاں مظاہرہ کیا اور اخبار میں اپنے کالموں کو زعفران زار بنائے رکھا۔ سرشار کے ایک پرخلوص دوست نے ایک مرتبہ اُن سے ”سروانٹس“ کے ”ڈان کوئکزٹ“ کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ کتاب جہاں سے بھی پڑھی جائے ہنسی کو روکنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ کاش اودھ میں کوئی ایسی تصنیف ہوتی تو سرشار نے اس کتاب کا ترجمہ ”خدائی فوجدار“ کے نام سے کیا اور اسی کتاب سے تخلیقی جذبہ لے کر ”فسانۂ آزاد“ لکھی۔ محمد حسن عسکری جیسے سخت نقاد نے بھی کہا تھا: ”ترجمے کی بدولت ہمیں ایسا تخلیقی جذبہ نہیں ملتا جیسا سرشار کو مل گیا تھا۔“(۳)

سرشار اس اخبار کے ساتھ بطور مدیر ۱۸۷۸ء تا ۱۸۸۰ء تک وابستہ رہے بعد ازاں بطور مصنف اس سے وابستہ رہے اس وابستگی کا دورانیہ بقول ڈاکٹر لطیف حسین ادیبؔ نامعلوم ہے اور اُن کا قیاس ہے کہ ۱۸۹۳ء تک ہے مگر ڈاکٹر احراز نقوی نے بعض شواہد کی بناء پر اس قیاس کی تردید کر دی ہے۔

سرشار نے ۱۸۹۵ء میں مدراس کا سفر کیا اور وہیں سے حیدر آباد روانہ ہو گئے۔ رسالہ دبدبہ آصفی کے مدیر بنے مہاراجہ سرکشن پرشاد نے اصلاح کلدم کے لیے ۲۰۰ (دو سو) روپے ماہوار پہ اپنا استاد مقرر کر لیا اور سرشار ان عنایات و انعامات پر خوش

بھی تھے کیونکہ اس دور میں مراحم خسروانہ ہی کو باعثِ افتخار سمجھا جاتا تھا۔ محققین نے اس دور میں سرشار کی طرف سے لکھے گئے ایک مضمون کا ذکر کیا ہے جس میں سے سرشار کی طمانیت کا اظہار ہوتا ہے۔

"چار برس کا زمانہ ہوا میں کانگریس کا ممبر ہو کر مدراس گیا تھا وہاں سے بخت رسا حیدر آباد لایا
مہاراجہ کشن پرشاد بہادر وزیر آصفی نے جو وزیر اور مدارلمہام بھی رہ چکے تھے مجھے بلوایا اور
دو سو کا نوکر رکھ لیا اور شعر و سخن نثر کی اصلاح لینے لگے اور کسی کلام پر خوش ہوتے تو فوراً
ایک اشرفی انعام دیتے۔ خلعت اور جوڑے سال میں تین چار بار عطا ہوتے ہیں۔" (۴)

عالمی ادبیات بالعموم اور اُردو ادباء بالخصوص اس المیے کا شکار رہے ہیں کہ انہیں خود کو پالنے کے لیے امراء اور حکام کے درباروں کا سہارا لینا پڑا ہے لیکن یہ بھی غنیمت جاننا چاہیے کہ افلاطون کی "یوٹوپیا" سے مقامی دربار تک کے سفر میں ادباء کو سراہا تو جانے لگا۔ بے شک یہ سرپرستی بخشش و عطاء ہی کی حد تک رہی اسے ادائے حق کا مقام نہ مل سکا اور بقول شاعر:

جو کچھ یہاں ملا بطریق عطا ملا

کے مصداق یہ حضرات اپنے اندر کے جواہر کو عوام تک تو لا سکے۔

سرشار کی قسمت یوں تو حیدر آباد آمد کے بعد اپنے عروج پر تھی کہ جس مہاراجہ سر کشن پرشاد کے اُستاد مقرر ہوئے وہ مہاراجہ بعض سیاسی تبدیلیوں کی بناء پر وزارت کے عہدے تک جا پہنچا مگر سرشار اپنے اندر کی نہ جانے کون سی کشمکش کو دبائے پھرتے تھے کہ شراب نوشی میں بے اعتدالی اور کثرت کی بناء پر بہت لاغر اور نحیف ہوتے چلے گئے۔ میرا جیؔ اور غالبؔ کی طرح جانے کس تخلیقی کرب پہ قابو پانے کے لیے یہ کثرت بادہ وجام تھی جسم سوکھ کر کانٹا ہوا جاتا ہے اور منہ سے لگی شراب ہے کہ

"چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی"

اور سرشار جیسے سراپا فن ادیب کا یہ حال تھا کہ رام بابو سکینہ کے بقول جب کسی مطبع کے مالک نے کچھ لکھوانا ہوتا تو شراب کی ایک بوتل پیش کرتا اور مضمون لکھ دیا جاتا۔ گویا سرشار کا لاشعور بھی فن میں ڈوبا ہوا تھا وہ لاشعور کی وادیوں کے بھی فن کار تھے اور یہی فن کی خالص ترین شکل اُن کی تصانیف میں جابجا نظر آتی ہے۔ سرشار کثرتِ بادہ نوشی کی وجہ سے ۲۷ جنوری ۱۹۰۳ء کو عالم بالا کو سدھار گئے مگر اُن کا فن، ان کی تصانیف، اُن کے کردار آج بھی زندہ ہیں اور یقیناً ادب اُردو کا جاوِداں سرمایہ ہیں۔ سرشار نے دیباچہ "وجود" پہ تو "لا" لکھ دیا مگر ان جاودانی کرداروں پہ سرشار کے فن نے "بقاء" کی مہر ثبت کر دی۔

مغلوں کے دور حکومت میں جاگیر دارانہ نظام قائم تھا یا تو جاگیر دار تھے یا ان سے متعلق محنت کش عوام لیکن انگریز حکومت نے جیسے ہی ہندوستان میں اپنے قدم مضبوط کیے۔ زرعی اصلاحات اور طبقاتی کشمکش کے خلاف قوانین نے معاشرے میں نئے طبقے کو

جنم دیا جو متوسط طبقہ کہلایا۔ متوسط طبقہ معاشرے میں بڑی تیزی سے اُبھر کر سامنے آیا یہ وہ طبقہ تھا جو نہ تو جاگیر دار اور سرمایہ دار طبقے سے میل کھاتا تھا اور نہ ہی مزدور طبقے میں اپنے آپ کو ضم کر سکتا تھا۔ وسائل کی کمی کی وجہ سے وہ نہ تو جاگیر دارانہ طرز زندگی اپنا سکتا تھا اور ہاتھ سے کام کرنے کو عار سمجھنے کی وجہ سے مزدور طبقے کے رہن سہن میں بھی اس کو اپنا نہیں سکا تھا۔ یہ طبقہ سرمایہ دارانہ اور محنت کش زندگی، دونوں کے ساتھ مصالحت پر آمادہ نظر نہ آیا۔ مصنوعی رکھ رکھاؤ، سفید پوشی اور نمود کے چکر میں اپنے آپ کو مبتلا کر کے قابل رحم حالت کو پہنچ گیا اور فراریت کے رجحان میں مبتلا ہو کر رسوم پرستی اور توہمات کی آڑ میں پناہ ڈھونڈنے لگا۔ یوں اس بے منزل اور بے قرار طبقے کی نمائندگی کیلئے سرشار نے "فسانہ آزاد" کو مفصل اور تجزیاتی دستاویز کے طور پر تخلیق کیا ہے۔

رتن ناتھ سرشار کے ناولوں میں متوسط طبقے کے کرداروں کے تجزیاتی مطالعہ سے ان کے مسائل کی باز آفرینی مقصود ہو تو اس تناظر میں ان گنت مثالیں سامنے آتی ہیں۔ اس کثرتِ احوال کا سبب یہ ہے کہ سرشار کے یہاں کرداروں کی بھرمار ہے اسی لئے ان کے ناول فسانۂ آزاد کو کرداروں کو جنگل کہا گیا اور فیض احمد فیض کے بقول "سرشار کا خوابِ پریشان ہے۔" (۵)

کرداروں کے انفرادی مطالعہ کی نسبت، مجموعی، معاشرتی خصوصیات اور متوسط طبقے کے رجحانات کے ذریعے سرشار کے یہاں مندرجہ ذیل حوالوں سے متوسط طبقے کے مسائل کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے جن کے طفیل یہ طبقہ معاشی اور معاشرتی زوال کا شکار ہوا۔ متوسط طبقے کے مشاغل اور وقت کی زیاں کاری متوسط طبقے میں اخلاقی زوال اور منشیات کا استعمال، متوسط طبقے میں رسومات پرستی جو کہ حدِ اعتدال سے آگے کی منزلوں پر پہنچی ہوتی ہے۔ متوسط طبقے کے نسائی کرداروں کے مسائل، متوسط طبقے کی توہم پرستی، زوال پذیر معاشرے میں دھوکہ اور فریب کا ماحول مذکورہ وباؤں کے پس منظر کی وضاحت کے ساتھ ساتھ سرشار کے یہاں اس بیمار معاشرت کے انجام کے اشارے واضح طور پر متوسط طبقے کی عکس بندی میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ وہ انجام جو بعد ازاں ان مسائل کے حاصل کے طور پر تاریخ میں ناقابلِ تردید دستاویز کی صورت میں موجود ہے۔ معاشرے کے ہر طبقے میں وقت گزاری کیلئے کچھ مشاغل ہوتے ہیں۔ ان مشاغل کا دائرہ اس طبقے کے وسائل دلچسپیوں، ترجیحات، تربیت، وراثتی عناصر، اخلاقیات اور استطاعت کے مطابق ہوتا ہے۔ انیسویں صدی میں ہندوستان کے زوال پذیر متوسط طبقے کے مشاغل کی فہرست شیطان کی آنت کی طرح طویل ہے۔ "فسانہ آزاد" کا ہیرو آزاد نئے اُبھرتے ہوئے متوسط طبقے (جس کی کوئی منزل نہیں) کی نمائندگی کرتا ہے۔ بقول فیض: "آزاد جس کی کوئی منزل نہیں جس کے قدموں کو کہیں قرار نہیں ایک نئے طبقے کا نمائندہ ہے۔" (٦)

اور سیر کہسار میں ہر طبقے کے مشاغل کی تفصیلات ملتی ہیں خصوصاً لکھنؤ جو "باہر با عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" کی عملی تعبیر بن کر سانس سانس جی رہا تھا ان کے یہاں عیش و نشاط اور تفریحی مشاغل اور وقت کی زیاں کاری کا عمل ان کی "بازیوں" سے نمایاں ہے۔ بقول مصحفی منہ تھیلیوں کے کھلتے ہیں از بہر طوائف مثلاً چانڈو بازی، مدک بازی، طوائف بازی، دغا بازی، پتنگ بازی،

بٹیر بازی اور کبوتر بازی وغیرہ۔ پتنگ بازی کے نامی گرامی استاد لکھنؤ میں موجود تھے میر عمدہ خواجہ مٹھن شیخ امداد اس کے علاوہ ولائت علی جو ولایتی کہلائے جاتے تھے پتنگ بازی میں نابغۂ روز گار تھے۔ بٹیروں کی لڑائی کا منظر کسی جنگِ عظیم کی محدود سطح پر پیشکش بن کر سامنے آتا ہے۔ نواب صاحب کے بٹیر صف شکن کی معرکہ آرائی ملاحظہ کیجئے:

> ''بھئی یہ بٹیر ایسا انمول ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اس نے اس دن نواب کی سات پیڑھیوں پر احسان کیا۔ واللہ کہیں گھٹ جاتا تو بندہ جنگل کی راہ لیتا۔ میاں جنگ میں آبرو ہی آبرو ہے اور ہے کیا۔'' (۷)

فسانۂ آزاد میں رتن ناتھ سرشار نے متوسط طبقہ کے اس نفسیاتی مسئلہ پر تفصیلاً قلم اُٹھایا ہے کہ جھوٹی شان و شوکت اور خود فریبی کی خاطر یہ طبقہ کس طرح کی طفل تسلیوں میں مبتلا ہے ایسا زوال پذیر طبقہ جو اپنی آن بان کھو چکا ہے اور اقتصادی بحران کا شکار رہے۔ جائیداد اور زمین مہاجنوں کے پاس گروی رکھی جا چکی ہے۔ اپنی جھوٹی شان کو برقرار رکھنے کیلئے بٹیروں کی لڑائی کو جنگ قرار دے کر اپنی فتح کا اعلان کرنا چاہتا ہے۔ "میاں جنگ میں آبرو ہی آبرو ہے اور کیا ہے"۔ گویا پورے ایک معاشرے کی آبرو بٹیر سے وابستہ ہے۔ بٹیروں کے نام بھی کسی بڑی جنگ کے سپہ سالاروں کے القاب پر رکھے گئے ہیں اور علاقائی تہذیبی اور معاشرتی محاذوں پر شکست خوردہ معاشرہ "واماندگئی شوق تراشے ہے پناہیں" کی عکاسی کر رہا ہے۔ بٹیروں کی "جنگِ عظیم" کی جزئیات ملاحظہ کیجئے:

> ''جیسے ہی دونوں چکھی کھا چکے ظفر پیکر بجلی کی طرح صف شکن کی طرف دوڑا۔ یہ ٹوری وہ گھا گھر۔ آتے ہی دبوچ بیٹھا اور چوٹی کو چونچ سے پکڑ کر ایسی ایسی مروڑیاں دیں کہ دوسرا ہوتا تو ایک رگڑے میں پھر سے بھاگ کھڑا ہوتا اتنے میں صف شکن قلفی کر کے لوٹ ہی تو پڑا ایسی لات جمائی کہ ظفر پیکر نے منہ پھیرنا تھا کہ صف شکن نے اُچک کر ایک جھنجھوٹی بتائی واہ واہ اسی مقام پر ایک اور لات کس کر۔'' (۸)

اگرچہ اکثریت نفسیاتی طور پر خود فریبی اور فرار کی روش پر قائم ہے لیکن سرشار نے متوسط طبقے کے تعداد میں قلیل لیکن اس باشعور حصے کی نشاندہی بھی کی ہے۔ جو ان مشاغل کو فضول کام تصور کرتے ہیں اور ان میں مبتلا افراد کو طعنے بھی دیتے ہیں اور جھنجھوڑنے کی کوشش بھی کرتے ہیں مثلاً:

> ''ان کو تو بس بٹیر کی کابک ہو اور دو چار پرانے جغادری، بٹیر باز میاں گجن اور مرزا فدائی اور حسو ماتمی اور لالہ گبرے مل اور بے تکی گپ اُڑتی ہو۔'' (۹)

سرشار نے یہاں پر باقی دُنیا کا ترقی کی راہ پر گامزن ہونا بھی دکھایا ہے۔ مادی، عقلی اور سائنسی ترقی برصغیر کے متوسط طبقہ کے اندر نئے شعور کی لہر بھی پیدا کرتی ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ تعلیمی ادارے کھل رہے ہیں ایسی صورت میں دقیانوسی شوق کی مذمت بھی سنائی دیتی ہے۔

''آپ تو حضرات بے پر کی اُڑاتے ہیں آپ نے تمام عمر بٹیر مٹھیایا اور ٹوری لڑا کئے آپ کو دُنیا ومافیا کی کیا خبر ہے کہ زمانے کا رنگ کیا ہے اور دُنیا میں کیا ترقی ہو رہی ہے۔ تو وجہ کیا ہے آپ کی دُنیا تو بس بٹیروں کی پالی ہے۔ دن رات چانڈو بازوں اور واہی تباہی آدمیوں کی اول جلدل تقریر سننے کے عادی ہیں۔ افیمی آپ کے مشیر، اٹھائی گیرے آپ کے وزیر۔'' (۱۰)

سرشار کو اس بات کا احساس ہے کہ زمانہ قیامت کی چال چل رہا ہے اور دوسری طرف بقول امیر مینائی:

یہاں نہ روبہ کی اور نہ شیر کی بحث رات دن ہے یہی بٹیر کی بحث

برصغیر کے شرفاء کی عاقبت نااندیشی تو اپنا رنگ پہلے ہی تاریخ کے سیاہ اوراق پر دکھا چکی ہے اور مساکین وغربا روٹی کو ترس رہے ہیں لیکن متوسط طبقہ بھی غفلت شعاری کی انتہاؤں کو چھو رہا ہے۔ حالانکہ یہی وہ معاشرتی حصہ ہے جو کسی نہ کسی طرح حالات کی مثبت پیش رفت کو یقینی بنا سکتا ہے لیکن ان کا حال بھی سستے تفریحی مشاغل، نشہ بازی اور بٹیر بازی نے دگرگوں کر رکھا ہے۔ بقول سرشار: ''سبھی گئے گزرے دن رات بخت واژگوں کی طرح اوندھے پڑے چانڈو اُڑا رہے ہیں۔'' (۱۱)

ان کے پاس ماسوا چانڈو کے کوئی اور شغل ہی نہیں ہے۔ یہی وہ ہندوستان کا غیر فعال متوسط طبقہ ہے جس کے بارے میں امیر مینائی نے کہا ہے۔ وہی کڑاکے اور وہی افیون کے گھولے ہیں۔ باطنی شخصی سدھار تو کُجا ان کو تو اپنی ظاہری حالت کا بھی ہوش نہیں۔ مکان کثیف ہیں۔ کپڑے میلے ہیں اور تیل اور افیم کاست کا شغل ہمہ وقت جاری ہے۔ نشے میں نڈھال، سستی اور کاہلی کا نمونہ بنے ہوئے ہیں۔ بیٹھیں تو اُٹھا نہیں جاتا اور اٹھیں تو پھر بیٹھنے کی سکت نہیں۔ بقول لطیف حسین ادیب:

''جب کوئی قوم زوال پذیر ہوتی ہے تو کسی مقصد کی جہد کا جذبہ بھی ختم ہو جاتا ہے انہیں ہمہ وقت عمل سے فرار کیلئے حسین بہانوں کی تلاش رہتی ہے۔'' (۱۲)

رتن ناتھ سرشار نے اپنے دلچسپ اسلوب میں برصغیر کے متوسط طبقے کے مسائل کی نشاندہی کرتے ہوئے جدید ترقی یافتہ اقوام اور ان کے رویوں کے ساتھ اپنے عہد کی معاشرت کا تقابلی مطالعہ بھی پیش کیا ہے اور اس سلسلے میں جب وہ اقوام عالم کو دیکھتے ہیں کہ روز افزوں ترقی پر ور رویے پروان چڑھ رہے ہیں اور اس کے برعکس مقامی آبادی کے اشغال کی فہرست پر طنزیہ اسلوب میں یوں روشنی ڈالتے ہیں:

> ”ہمارے شہر میں وہ باتیں ہوتی ہیں جو ترقی ملک کی دشمن، خانہ بر انداز ترقی آتش زن کا لائے آسودگی اور فروغ بازار رہتا ہے اور پریشان حال ہیں مثلاً بٹیر بازی اس کا اہل لکھنؤ کا بڑا شوق ہے۔ بڑے نامی وثیقہ دار ہیں۔ بڑے معزز آدمی صدہا آدمیوں کی روٹیاں ان کی بدولت چلتی ہیں مگر بٹیر بازی پر جان دیتے ہیں۔ کبوتر بازی کی وہ کثرت کہ الامان، جدھر دیکھیں 'کو اور کا' کی آواز بلند ہے جہاں جایئے چھپی ہل رہی ہے۔ کئی کی جان عذاب میں ہے اس کے علاوہ پتنگ بازی بھی ایک بڑا شغل ہے میدان بدلے جاتے ہیں۔، مرغ بازی کا شوق ان سب سے بڑھا ہوا ہے۔ گھنٹوں گتھے پڑے ہوئے ہیں خون کے شراٹے بہہ رہے ہیں ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے ہوئے ہیں۔ ایک ایک پر دس دس گرے پڑے ہیں۔ ہنگامہ محشر بپا ہے۔ چانڈو بازنے رہی سہی مٹی خراب کر دی۔ مدک بازی کا شوق تو شہر میں پہلے ہی تھا اور چرس کی بھی گرم بازاری تھی۔ اب فرمایئے جس شہر میں بے فکرے پن کی اس قدر گرم بازاری ہو وہاں افلاس اور عسرت کیوں نہ ترقی کرے۔“ (۱۳)

مندرجہ بالا مفصل اقتباس میں رتن ناتھ سرشار نے آخری جملے میں متوسط طبقے کے معاشی زوال کی تیز رفتاری اور اس کے وہ اسباب بیان کر دیے ہیں جو اس طبقے کو عنقریب افلاس کی ناقابل گریز دلدل میں دھنسنے کو تیار ہیں۔ فسانہ آزاد کا خوجی جو خود بھی پتنگ بازی کے شوق میں مبتلا ہے۔ بلکہ اپنے آپ کو فن پتنگ بازی کا ماہر بتاتا ہے ترکی میں جب مَیڈا کو اپنے ملک کے حالات بتاتا ہے تو فن پتنگ بازی پر مفصل گفتگو کرتا ہے اور آخر میں یہ انکشاف کرتا ہے کہ پیچ کے بعد ڈور لوٹنے والوں کی چاندی ہوتی ہے اور لوگ ایک ایک دن میں دس دس سیر ڈور لوٹ لیتے تھے۔ متوسط طبقے کے اندر ایسے اشغال کس حد تک رچ بس چکے ہیں اور ان کے لئے مادی مسائل کا پیش خیمہ تو بنتے ہی تھا۔ اخلاقی دیوالیہ پن بھی ان اشغال کی دین تھا اور اخلاقی و معاشرتی جرائم بھی جنم لیتے تھے کہ ان فضول بازیوں کیلئے وسائل کی فراہمی کے لیے درکار تھے۔ مثلاً فسانہ آزاد میں ایک ایسے پتنگ باز کو بھی متعارف کرایا گیا ہے جس کی ملاقات آزاد سے سرراہ ہوتی ہے جو گھر سے سونے کے کڑے چوری کر کے پتنگ بازی کا شوق پورا کرتا ہے۔ ظاہر ہے یہ کڑے اسی گھر کی کسی بہو، بہن یا ماں کے ہوں گے۔ جب انیسویں صدی کے متوسط طبقہ کے مسائل کی بات ہو تو اخلاقی بحران کا مسئلہ مذکورہ صورتوں میں جابجا سامنے آتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ احراز نقوی،ڈاکٹر، پنڈت رتن ناتھ سرشار، بحیثیت ناول نگار، کراچی: مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی ۲۰۰۶ء، ص:۴۸

۲۔ ایضاً، ص:۵۴

۳۔ محمد حسن عسکری، مجموعہ محمد حسن عسکری، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۰۸ء، ص:۳۰۵

۴۔ احراز نقوی،ڈاکٹر، پنڈت رتن ناتھ سرشار بحیثیت ناول نگار، ص:۵۸

۵۔ فیض احمد فیض، میزان، لاہور: سر کلر اکیڈمی، ۱۹۶۵ء، ص:۲۰۷

۶۔ ایضاً، ص:۲۲۷

۷۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار، فسانۂ آزاد، جلد اوّل، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اُردو، ۲۰۰۲ء، ص:۲۴۸

۸۔ ایضاً

۹۔ رتن ناتھ سرشار، سیر کہسار، جلد دوم، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء، ص:۹۶

۱۰۔ ایضاً، ص:۹۷

۱۱۔ ایضاً، ص:۱۷۷

۱۲۔ لطیف حسین ادیب، ڈاکٹر، سرشار کی ناول نگاری، کراچی: انجمن ترقی اُردو، ۱۹۶۱ء، ص:۲۹۱

۱۳۔ رتن ناتھ سرشار، سیر کوہسار، ص:۱۸۰